© rasailojaraid.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نظرات

یوں تو ہر قوم کی ترقیات میں اس کے تعلیمی نظام کی عمدگی کو ہر زمانہ میں دخل ہوتا ہے لیکن جب کوئی قوم اپنا سیاسی اقتدار کھو بیٹھتی ہے تو اس وقت یہ ضرورت بہت زیادہ شدید ہو جاتی ہے۔ کیونکہ سیاسی بیچارگی کے عالم میں اب اس کے پاس صرف تعلیمی نظام کا ہی ایک ایسا حربہ رہ جاتا ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے افراد میں قومی روایات و خصوصیات کا احترام باقی رکھ سکتی ہے اور جس کی وجہ سے وہ دوسری فاتح و غالب اقوام میں ضم اور مدغم ہو جانے سے محفوظ رہ سکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ [illegible] مسلمان سیاسی اقتدار و عظمت سے محروم کر دیئے گئے تو اس ملک کے دور اندیش مفکرین و ارباب رائے نے مسلمانوں کی تعلیم کی طرف توجہ کی اور دن رات کی جدوجہد کے بعد مختلف تعلیمی ادارے قائم کئے۔ علیگڈھ میں سرسید اور ان کے رفقاء نے مدرسۃ العلوم کی بنیاد رکھی جو آج ہندوستان کی ایک عظیم الشان یونیورسٹی کی شکل میں موجود ہے۔ دوسری طرف مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور ان کے ساتھیوں نے دیوبند میں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی جو آج نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام براعظم ایشیا کی سب سے بڑی اسلامی اور دینی علوم وفنون کی درسگاہ ہے۔ دونوں کا مقصد مسلمانوں کو اُن تباہ حالیوں سے بچا لینا تھا جن سے حکومت چھن جانے کے باعث وہ دوچار ہو سکتے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ سرسید کے پیش نظر مسلمانوں کی دنیوی فلاح تھی اور علماء ربانیین کی اس جماعت کا مقصد مسلمانوں کی دینی اور مذہبی حیثیت کا بقا و تحفظ۔ اور ان کو حکومتِ متسلطہ کے تہذیبی و تمدنی اثرات سے بچا لینا تھا۔

یہ دونوں ادارے جن مقاصد کے ماتحت قائم کئے گئے تھے ان میں کامیاب رہے۔ علیگڈھ نے ایسے مسلمان پیدا کئے جو حکومت کے عہدوں اور دفتروں پر قبضہ کر سکیں اور دیوبند سے ایسے علماء کی جماعتیں نکلیں جنھوں نے ناموافق حالات و ماحول میں دینِ قیم کا بھرم رکھ لیا۔ اور اس کے پرچم کو سرنگوں نہیں ہونے دیا۔ ان دونوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تعلیمی اداروں کا مقصد اگرچہ مسلمانوں کی فلاح وبہبود ہی تھا لیکن دین اور دنیا میں جو فرق وامتیاز ہے وہ ان اداروں کے طریق عمل میں رونما تھا۔ دونوں دو مختلف سمتوں میں جا رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حلیف ہونے کے بجائے دونوں ایک دوسرے کے شدید مخالف اور حریف ہوگئے۔ اس تقابل پر جو اثرات مرتب ہوئے وہ آج برائے العین مشاہدہ میں آرہے ہیں۔ ایک نے اپنی توجہ مسلمانوں کی صرف دنیوی ترقی پر مرکوز رکھی اور ان کی دینی بدحالی وابتری کی ذرا پروا نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان ڈپٹی کلکٹر، کلکٹر اور بیرسٹر تو پیدا ہوئے۔ مگر شکل وصورت اور وضع قطع کے لحاظ سے یہ لوگ ایسے تھے کہ گویا فرنگی تہذیب کی مشنری کے کل پرزے بن گئے تھے۔ دوسری طرف اکثریت ایسے علمار کی تھی جو اسلامی علوم وفنون میں دستگاہ کامل رکھنے کے باوجود وہ اس قابل نہیں تھے کہ جدید علمی دنیا کی بزم نو آئین میں آکر اسلامی مسائل کو سمجھا سکتے۔

اس صورتِ حال کے باعث بعد میں دو درسگاہیں اور پیدا ہوئیں۔ ایک ندوۃ العلمار لکھنؤ۔ اور دوسری جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ ان میں سے پہلی درسگاہ کا مقصد یہ تھا کہ علمار کو قدیم علوم کے ساتھ بعض ضروری علوم عصریہ سے بھی آگاہ کیا جائے اور ساتھ ہی قدیم نصابِ تعلیم میں جو نقائص ہیں ان کی اصلاح کی جائے دوسری درسگاہ یعنی جامعہ کا مقصد علمار کا پیدا کرنا نہیں تھا بلکہ ایسے گریجویٹ مسلمانوں کی پیداوار تھا جو مغربی علوم وفنون کے ساتھ دینیات اور اسلامیات سے بھی آگاہ ہوں اور جنھوں نے تعلیم محض تعلیم کے لئے حاصل کی ہو نہ کہ حکومتِ موقتہ کے دفتروں میں ملازمت حاصل کرنے کے لئے۔ غرض یہ ہے کہ تمام ہندوستان میں مسلمانوں کی یہی کل چار قومی درسگاہیں تھیں جو اپنے اپنے مطمح نظر کے ماتحت کام کر رہی تھیں۔ ایک خالص دینی دیوبند، دوسری خالص دنیوی یعنی علیگڈھ۔ تیسری دینی مگر دنیا آمیز، ندوہ۔ چوتھی دنیوی مگر دین آمیز یعنی جامعہ ان درسگاہوں نے اپنے اپنے مخصوص اندازِ تربیت کے ماتحت جو افراد پیدا کئے وہ خواہ ایک دوسرے سے کتنے ہی مختلف رہے ہوں لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان حضرات نے مسلمانوں کی قومی زندگی کو اپنے علم اور کردار سے ضرور متاثر کیا۔ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کیسی ہی ہو لیکن بہرحال محمد علی۔ شوکت علی۔ اور حسرت موہانی جیسے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے فرزندوں پر ہندوستانی مسلمانوں کو اب بھی ناز ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اسلامی ہند کا مورخ شیخ الہند سید محمد انور شاہ کشمیری، عبید اللہ سندھی کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ارباب ندوہ و جامعہ نے تعلیم اور تصنیف و تالیف کے میدان میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ بھی مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کی تاریخ میں لائق فراموشی نہیں۔

لیکن یہ جو کچھ آپ نے سنا ان درسگاہوں کا "کل" کا حال تھا۔ آج ان سب کی جو حالت ہے وہ حد درجہ مایوس کن اور تشویش انگیز ہے۔ جامعہ اور علیگڈھ پر تو پھر کبھی فرصت میں تفصیلاً لکھا جائیگا۔ ندوہ اور دیوبند دونوں کی موجودہ حالت یہ ہے کہ اب یہاں تعلیم و تعلم سے زیادہ اربابِ سیاست کی اقتدار طلبی کے ہنگامے گرم رہتے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں دفتر برہان میں طلبار ندوہ کا جو طویل مراسلہ موصول ہوا تھا اگر اس میں کچھ بھی صداقت ہے تو اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ ندوہ اپنی تعلیمی خصوصیات سے روز بروز دور ہوتا چلا جارہا ہے اور وہ اپنی انفرادیت کھو کر عام عربی کے مدارس کی صف میں شامل ہوتا جاتا ہے۔ اب رہا دیوبند تو اس کا حال ندوہ سے بھی زیادہ المناک ہے جو درسگاہ مسلمان طلبہ کی خالص تعلیمی اور اخلاقی تربیت و اصلاح کے لئے قائم کی گئی تھی اور جہاں کے علماء کے لئے اربابِ باطن ہونا بھی ضروری سمجھا جاتا تھا اب وہ اقتدار طلبی کی جنگ کا میدان بن کر رہ گئی ہے۔

اگرچہ دیوبند کی علمی خصوصیت و شان تو حضرت شاہ صاحبؒ کی علیحدگی کے وقت ہی رخصت ہو گئی تھی۔ لیکن اب تو بالکل ہی اندھیر نظر آتا ہے۔ پرانے اور تجربہ کار اساتذہ کی جگہ نامعروف اور ناتجربہ کار مدرسین رکھے جارہے ہیں اور پھر لطف یہ ہے کہ ان لوگوں کے ناموں کے ساتھ بڑے بڑے القاب و آداب لکھکر مسلمانوں کو فریب دینے کی کوشش کی جارہی ہے۔

فالی اللہ المشتکی ومنہ المرتجی

© rasailojaraid.com